© rasailojaraid.com

دعوتِ انبیاء کے خصائص قرآن کریم کی روشنی میں

محمد رضی الاسلام ندوی

اللہ کے بندوں تک اس کا دین پہنچانے اور انھیں راہِ حق کی طرف دعوت دینے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسی نہج کو اپنایا جائے جسے انبیاء کرام نے اختیار کیا تھا اور انہی رویّوں کی پیروی کی جائے جو ان کی پاکیزہ سیرتوں کا مثالی جوہر تھے۔ کوئی تعلیم کتنی ہی اعلیٰ اور مثالی اور کوئی بات کتنی ہی قدر و قیمت اور اہمیت کی حامل کیوں نہ ہو، اگر اس کی پیش کش کا انداز صحیح نہیں ہے تو وہ اپنی تاثیر کھو بیٹھتی ہے اور مخاطبین اور سامعین کے دل اس کی طرف ذرا بھی مائل نہیں ہوتے۔ دعوت کی اثر پذیری کے لیے ضروری ہے کہ یہ چیز شدّت کے ساتھ ملحوظ رہے کہ کوئی بات کب کہی جائے اور کس لہجہ میں کہی جائے؟ مخاطبین کی نظروں میں داعی کی شبیہ (Image) کیسی ہو؟ دعوت کی پیش کش کے دوران وہ کیسے رویّہ کا مظاہرہ کرے؟ اسے راہِ دعوت کے نت نئے اور پیچیدہ مسائل کا ادراک ہو اور وہ پوری حکمت و دانائی کے ساتھ انھیں حل کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ بسا اوقات میدانِ دعوت میں سرگرم لوگ پوری تن دہی اور اخلاص کے ساتھ کام کرتے ہیں، لیکن طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود جب ان کی دعوت ثمر بار نہیں ہوتی تو اس کا الزام مخاطبین کے سر ڈالنے لگتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ دعوت کی عدمِ قبولیت کا سبب مخاطبین کی سنگ دلی اور ان کے گم راہ رہنے کا فیصلۂ الٰہی ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اللہ کے ان بندوں کو دعوت صحیح طریقہ سے پیش ہی نہیں کی گئی اور اس کے ضروری تقاضے اور آداب ملحوظ رکھے ہی نہیں گئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کریم میں تذکرۂ انبیاء کے ضمن میں اس موضوع پر بھی قیمتی معلومات ملتی ہیں۔ ضروری ہے کہ داعیانِ کرام انھیں حرزِ جان بنائیں اور ان کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔

یہاں انبیاء کرام کے طریقۂ دعوت سے متعلق چند نکات کی وضاحت کی جارہی ہے:

۱- کارِ دعوت میں انہماک

داعی کا ایک بنیادی وصف یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے مدعوئین کو راہِ حق پر لانے کی کوشش کرے۔ دعوت اس کا اوڑھنا بچھونا بن جائے۔ وہ فنا فی الدعوۃ ہوجائے۔ اسے ہر آن اپنے مخاطبین کی فکر دامن گیر ہو۔ وہ ان کی گم راہی سے کڑھے اور ان کی راہ یابی کی شدید خواہش اس کے دل میں پائی جائے۔ وہ مختلف تدابیر سوچے اور ان پر عمل کرکے انھیں گم راہی کے گڑھے سے نکالنے کی کوشش کرے۔

انبیائے کرام کی سیرتوں کا مطالعہ کرنے سے ان کا یہ پہلو بہت ابھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کی گم راہی پر بہت زیادہ متفکّر رہتے تھے اور ان تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے تھے۔ پھر جب ان کی قوم ان کی دعوت پر کان نہ دھرتی اور اپنی عیّاشیوں و بداعمالیوں میں مست رہتی تھی تو وہ بہت زیادہ پریشان ہوجاتے تھے۔ قوم کی گم راہی انہیں کسی کروٹ چین نہ لینے دیتی تھی۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے وقف تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتی زندگی ایک لمبے عرصے کو محیط تھی۔ قرآن کے بیان کے مطابق وہ ساڑھے نو سو سال تک دعوتی فریضہ انجام دیتے رہے (العنکبوت:۱۴) نسلوں پر نسلیں گزر گئیں، مگر گنتی کے چند افراد کے علاوہ کوئی ایمان نہ لایا۔ حضرت نوحؑ نے ان تھک جدّ و جہد کی۔ ہر ممکن طریقے سے انھیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور کفر و شرک سے توبہ کرنے کی تلقین کی، دن رات ایک کردیا، کھلے چھپے، انفرادی اجتماعی، ہر طریقے سے انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی، لیکن ان کی سرکشی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کا یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باغیانہ رویہ حضرت نوحؑ پر کس قدر شاق تھا اور وہ ان کی ہدایت کے لیے کس قدر اپنے آپ کو ہلکان کیے ہوئے تھے، اس کا اندازہ ان کی اس دعا سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے آخر کار ان کی ہدایت سے مایوس ہو کر بارگاہِ الٰہی میں کی تھی:

رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلاً وَّنَهَاراً. فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَاراً. وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَاراً. ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَاراً. ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَاراً......۔ (نوح/۵-۹)

اے میرے رب، میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا، مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا کہ تو انہیں معاف کر دے، انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے اس پہلو کو قرآن کریم نے بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ اس میں آپ کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ آپ پر یہ بہت شاق گزرتا ہے کہ اللہ کے بندے کسی مشقت اور مصیبت میں مبتلا ہوں۔ آپ کی شدید خواہش رہتی ہے کہ وہ گم راہی سے نکل کر سیدھی راہ پر چلیں۔ ساتھ ہی یہ بھی تلقین کی گئی کہ اگر آپ کی شدید خواہش اور انتہائی کوشش کے باوجود لوگ راہِ حق کو قبول نہیں کرتے ہیں تو آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ. فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ۔ (التوبۃ/۱۲۸-۱۲۹)

تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق و رحیم ہے۔ اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ کے رسول ﷺ، اپنی قوم کو ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتے، ان کے سامنے دعوتِ حق پیش کرتے اور ان سے ایمان لانے کا مطالبہ کرتے۔ کتبِ سیرت میں کثرت سے ایسے واقعات مروی ہیں جن سے آپ ﷺ کی دعوتی جاں فشانی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن ان کی جانب سے قبولِ حق کی آمادگی نہ دیکھ کر آپ ﷺ پریشان ہو جاتے، ان کی تباہی و بربادی آپ کو بالکل سامنے دکھائی دیتی، جس سے آپ ﷺ پر اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلّی دی کہ کسی کا ہدایت یافتہ یا گم راہ ہونا اس کا اپنا معاملہ ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے بارے میں طے کر لے کہ وہ کسی حال میں سیدھی راہ پر نہیں چلے گا، اس کے نزدیک حق اور ناحق کے پیمانے بدل گئے ہوں اور وہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھتا ہو تو کوئی دوسرا اس شخص کیا کر سکتا ہے۔

أَفَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَناً فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ۔ (فاطر/۸)

"(بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس شخص کی گم راہی کا) جس کے لیے اس کا برا عمل خوش نما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھ رہا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گم راہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔ پس (اے نبی) خواہ مخواہ تمھاری جان ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گھلے۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ واضح کرتا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو جبری طور سے راہِ حق پر چلنے کا پابند کر دیتا۔ وہ کوئی ایسی نشانی نازل کر دیتا جسے دیکھ کر تمام لوگ سرِ اطاعت خم کر دیتے، لیکن یہ چیز اس کی سنت کے خلاف ہوتی۔ اس نے دنیا کی تخلیق امتحان گاہ کی حیثیت سے کی ہے اور یہاں انسانوں کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے۔ اس لیے اے پیغمبر ﷺ، اگر یہاں کچھ لوگ تمھاری بات نہیں سنتے ہیں اور گم راہی اختیار کیے ہوئے ہیں تو تمھیں بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے غم میں اپنے آپ کو نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گھلاؤ۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ کسی کا ہدایت پانا یا نہ پانا اللہ تعالیٰ کی مشیّت پر منحصر ہے:

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ أَلَّا یَکُونُوا مُؤْمِنِینَ. إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِم مِّنَ السَّمَاءِ آیَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِینَ۔ (الشعراء/۳-۴)

اے نبی، شاید تم اس غم میں اپنی جان کھودو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کرسکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔

سورۂ الکہف میں ہے:

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ یُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِیثِ أَسَفًا۔ (الکہف/٦)

اچھا تو اے نبی، شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودینے والے ہو، اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور خاص طور سے مکّی زندگی پر اگر سرسری نظر بھی ڈال لی جائے تو اللہ کے بندوں کی گم راہی پر آپ ؐ کی فکر مندی، بے چینی اور ان کی ہدایت کے لیے آپ ﷺ کی جاں فشانی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ ؐ ہر جگہ اور ہر حال میں لوگوں کو قرآن سناتے اور انھیں اللہ کا دین قبول کرنے کی دعوت دیتے۔ انفرادی ملاقاتوں میں بھی، عام مجلسوں میں بھی اور حدودِ حرم میں بھی، عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں جاکر لوگوں میں دین کی تبلیغ کرتے۔ باہر سے جو لوگ عمرہ، زیارت یا کسی اور غرض سے مکہ آتے ان سے بھی ملاقات کرکے ان تک اللہ کا دین پہنچاتے۔ حج کے زمانے میں جب لوگ منیٰ میں قیام کرتے، اس وقت بھی آپ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے اور اہلِ قبیلہ تک پیغامِ حق پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ آپ کی یہ سرگرمیاں شعب ابی طالب کی محصوری کے سخت ترین ایّام میں بھی جاری رہیں۔

ابن اسحٰق نے لکھا ہے:

”جب بھی لوگ موسم حج میں اکٹھا ہوتے، رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لے جاتے۔ انھیں اللہ اور اسلام کی طرف دعوت دیتے۔ ان سے بتاتے کہ ”اللہ نے مجھے ہدایت اور رحمت کے ساتھ تمھارے پاس بھیجا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے"۔ آپ کو جوں ہی معلوم ہوتا کہ مکہ میں عرب کے کسی حصے سے کوئی ایسا شخص آیا ہے جو عزت و شرف کا مالک ہے، فوراً اس کے پاس پہنچ جاتے، اسے اللہ کی دعوت دیتے اور اس کے سامنے اپنی تعلیمات پیش کرتے۔"[۱]

رسول اکرم ﷺ لوگوں کی گم راہی پر کتنے متفکر رہتے تھے اور انہیں راہِ حق پر لانے کے لیے کتنے جتن کرتے تھے اس کو ایک حدیث میں تمثیل کے انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"انما مثلی ومثل الناس کمثل رجل استوقد نارا، فلما اضاءت ماحوله جعل الفراش وهذه الدواب التی تقع فی النار یقعن فیها، فجعل ینزعهن ویغلبنه، فیقتحمن فیها، فانا آخذ بحجزکم عن النار، وهم یقتحمون فیها"[۲]

میری مثال اور لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ جلائی، جب روشنی پھیل گئی تو پتنگے اور آگ میں گرنے والے کیڑے مکوڑے اس میں گرنے لگے۔ وہ شخص انھیں اس میں گرنے سے بچانے کی کوشش کرنے لگا اور وہ پتنگے اس شخص کی کوشش کو ناکام کرتے ہوئے اس میں گرتے رہے۔ اسی طرح میں تمھاری کمر پکڑ پکڑ کر جہنم کی آگ سے نکال رہا ہوں اور تم اس میں گرنے کی کوشش کر رہے ہو جس طرح وہ پتنگے آگ میں گر رہے تھے۔

۲- جلد بازی سے احتراز

داعی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت کے معاملے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے، بلکہ پورے صبر و تحمّل کے ساتھ اپنے مشن سے لگا رہے اور اپنے کام سے کام رکھے۔ اس کے مخاطبین اس کی باتیں سنیں یا نہ سنیں، اس کی تعلیمات کو قبول کریں یا نہ کریں، اس کے ساتھ اعراض اور لاتعلّقی کا معاملہ رکھیں یا اسے جھٹلائیں اور اذیّتیں دیں، وہ ہر حال میں اپنے فریضۂ منصبی کو ادا کرتا رہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ وہ گم راہ انسانوں کو بہ جبر راہِ ہدایت پر لے آئے، لیکن اس کا کام یہ ضرور ہے کہ جو مشن اسے سونپا گیا ہے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں جی جان سے لگا رہے، جو ہدایات اسے دی گئی ہیں ان کی تعمیل کرتا رہے اور اس وقت تک کرتا رہے جب تک کہ مشن سونپنے والا خود ہی اس کے مکمل ہونے کا اعلان نہ کر دے۔

اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

قُلْ يٰأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ. وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۔(یونس/ ۱۰۸-۱۰۹)

اے محمد کہہ دو کہ لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے۔ اب جو بھی سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے اور جو گم راہ رہے اس کی گم راہی اسی کے لیے تباہ کن ہے۔ اور میں تمھارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔ اور اے نبی، تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمھاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جارہی ہے اور صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

بسا اوقات جب داعی یہ دیکھتا ہے کہ اسے کارِ دعوت انجام دیتے ہوئے لمبا عرصہ گزر گیا ہے، اس کے باوجود اس کے مخاطبین کے دل اس کی دعوت کی طرف مائل نہیں ہو رہے ہیں اور وہ اس پر کان نہیں دھر رہے ہیں تو اس پر مایوسی کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے، اسے ان کے راہ یاب ہونے کی امید کم سے کم تر دکھائی دیتی ہے اور وہ انھیں مستحقِ عذاب سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسانوں کا اللہ تعالیٰ کے معاملات کو اپنے وقت کے پیمانوں سے ناپنا درست نہیں۔ جس مدت کو وہ بہت طویل اور صبر آزما سمجھتے ہیں وہ اللہ کی نظر میں بہت معمولی اور مختصر ہے۔ وہ پیغمبر کو مخاطب کرتا ہے کہ تم انجام کی پروا کیے بغیر پوری تن دہی اور دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ اگر تمھارے مخاطبین تمھاری دعوت کو رد کرتے اور تمھیں جھٹلاتے ہیں تو اس سے دل برداشتہ نہ ہو۔ اگر وہ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جو وقت طے کر رکھا ہے اس پر وہ آ کر رہے گا اور کوئی اسے دفع نہ کر سکے گا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ. لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ. مِّنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ. تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ. فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا. إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَنَرَاهُ قَرِيبًا۔ (المعارج ۱-۷)

مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے، (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے ہے، کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں، اس اللہ کی طرف سے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے، ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں۔ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پس اے نبی صبر کرو، شائستہ صبر۔ یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

قرآن اس معاملے میں انبیاء کی تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ انبیاء کو جن قوموں کے پاس بھیجا گیا ان کے درمیان رہ کر انھوں نے اپنی ذمہ داری کما حقہٗ انجام دی۔ ان کی قوموں نے انھیں جھٹلایا، ان کے درپے آزار ہوئے، انھیں طرح طرح سے ستایا اور تکلیفیں پہنچائیں، لیکن انھوں نے اپنے مشن سے ذرا بھی غفلت نہیں برتی اور جو کام انہیں سونپا گیا تھا اسے بھرپور طریقے سے انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نافذ ہوا اور ان کے مخالفین اپنے انجام سے دوچار ہوئے۔ آخری پیغمبر کو مخاطب کرکے وہ کہتا ہے:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَى مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّى أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ۔ (الانعام ۳۴)

تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انھیں پہنچائی گئیں، انھوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ انھیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن گزشتہ قوموں میں سے قوم نوح، عاد اور ثمود کا نام لے کر کہتا ہے کہ ان کا اور ان کے علاوہ دیگر بہت سی قوموں کا، جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے، حال یہ تھا کہ ان کے پاس اللہ کے پیغمبر روشن تعلیمات اور کھلی نشانیاں لے کر پہنچے، مگر انھوں نے ان کی تعلیمات کا انکار کیا، ان کی دعوت میں شک کا اظہار کیا اور انھیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ اس کے باوجود ان پیغمبروں نے ذرا بھی ہمت نہ ہاری، اذیتوں پر صبر کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے محاذ پر ڈٹے رہے۔ انھوں نے اپنی قوموں پر واضح کر دیا:

وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَى مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ۔ (ابراہیم/۱۲)

اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں، جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہ نمائی کی ہے۔ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسا اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں قرآن بعض پیغمبروں کی مثالیں بھی بیان کرتا ہے۔ راہِ دعوت میں طویل جدّ وجہد کی روشن مثال حضرت نوح علیہ السلام کی ہے۔ ان کی قوم کی اکثریت نے ان کی دعوت قبول نہیں کی اور کفر اور سرکشی کی راہ پر گام زن رہی۔ صدیاں گزر گئیں۔ یکے بعد دیگرے نسلیں آتی جاتی رہیں، مگر ان کے دل دینِ حق کے لیے نرم نہیں ہوئے۔ قرآنی بیان (العنکبوت/۲۹) کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام ان کے درمیان ساڑھے نو سو سال تک مسلسل فریضۂ دعوت انجام دیتے رہے۔ بالآخر جب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور وہ ان کی ہدایت سے بالکل مایوس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات نافذ ہوا اور ان کی سرکش و نافرمان قوم غرقاب کر دی گئی ہے۔

دوسری مثال حضرت یونس علیہ السلام کی ہے۔ انھیں اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا۔ ان لوگوں کا پایۂ تخت نینویٰ نامی مشہور شہر تھا۔ اس وقت ان کی آبادی ایک لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل تھی (الصّٰفّٰت/۱۴۷) حضرت یونسؑ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھیں راہِ ہدایت پر لانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ کسی صورت میں ایمان نہ لائے۔ بالآخر حضرت یونسؑ نے ان کے سرکش رویے پر سخت ناراضی کا اظہار کیا اور تیسرے دن ان پر عذاب آنے کی دھمکی دے کر بستی سے چلے گئے۔ قرآنی بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بستی کو چھوڑنے کا فیصلہ حضرت یونسؑ کا اپنا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار نہ کیا، بلکہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی اجازت کے بغیر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عاجلانہ اقدام پر ان کی سرزنش فرمائی:

وَذَا النُّونِ إِذ ذَّهَبَ مُغَاضِباً فَظَنَّ أَن لَّن نَّقْدِرَ عَلَيْهِ۔ (الانبیاء/۸۷)

اور مچھلی والے کو (بھی ہم نے نوازا) یاد کرو، جب کہ وہ بگڑ کر چلا گیا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ. إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ۔ (الصّٰفّٰت/۱۳۹-۱۴۰)

اور یقیناً یونس بھی رسولوں میں سے تھا۔ یاد کرو جب وہ ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔

'ابق' کے لفظی معنٰی ہیں غلام کا اپنے آقا کے پاس سے بھاگ جانا (الاِباق هرب العبد من سيده ۳) اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ حضرت یونسؑ نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا اور اذنِ الٰہی سے قبل ہی بستی سے نکل گئے۔ قرآن کریم میں ایک اور موقع پر اس کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے آخری رسول کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ۔ (القلم/۴۸)

اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ۔

اپنی اس غلطی پر متنبہ ہوتے ہی حضرت یونسؑ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کیا اور اس سے معافی مانگ لی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف فرمایا (الانبیاء/۸۷-۸۸، الصّٰفّٰت/۱۴۳، القلم/۱۴۹-۱۵۰) اس ایک مثال کے علاوہ انبیاء کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے پوری جاں فشانی، استقرار اور صبر وسکون کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام انجام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا اور حکمِ الٰہی کے مطابق آخر وقت تک ڈٹے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان آ گیا اور نافرمان قوموں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے آخری پیغمبر کو گزشتہ پیغمبروں کا اسوہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ بَلَاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ۔ (الاحقاف/۳۵)

پس اے نبی، صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو، جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انھیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انھیں یوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی۔ اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟

راہِ حق میں ثابت قدم رہنے، مخالفتوں کے ہجوم کی پروانہ کرنے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے اور منکرین و مخالفین کے معاملے میں جلد بازی نہ کرنے کی بار بار تلقین آخری رسول حضرت محمد ﷺ کو بھی کی گئی ہے۔ آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہیں، اس لیے اگر آپ کی قوم کے لوگ آپ پر ایمان نہیں لا رہے ہیں، بلکہ آپ کو تکلیفیں پہنچا رہے اور آپ کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں تو آپ دل برداشتہ نہ ہوں، غم نہ کریں اور نہ ان پر جلد عذاب آنے کے خواہاں ہوں۔ انھیں ایک مقرّرہ مدّت تک کے لیے ڈھیل دی گئی ہے، پھر ان کی سخت پکڑ ہوگی اور انھیں کوئی جائے فرار نہ ملے گی۔ اس مضمون کی چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ۔ (النحل/۱۲۷)

اور (اے نبی) صبر سے کام کیے جاؤ۔ اور تمھارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ۔(الطور/۴۸)

(اے نبی) اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ ۔ (الروم/۶۰)

پس (اے نبی) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۔(مریم/۸۴)

اچھا تو اب ان پر نزولِ عذاب کے لیے بے تاب نہ ہو۔ ہم ان کے دن گن رہے ہیں۔

۳- خیر خواہی

دعوت کے مؤثر ہونے کا ایک راز یہ ہے کہ داعی اپنے مخاطبین کے سامنے خود کو ان کا خیر خواہ ثابت کرے۔ وہ ان پر واضح کردے کہ اس کی ساری جدّ وجہد اور تگ ودو کا مقصد اس کا اپنا کوئی مفاد نہیں، بلکہ خود ان کی بھلائی ہے۔ وہ ان کا سچا ہم درد ہے۔ ان کی گم راہی اس پر شاق گزرتی ہے۔ وہ ان تک کلمۂ حق پہنچا رہا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ وہ اسے قبول کرلیں۔ اس میں ان کی دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔

اگر آدمی کسی شخص کو اپنا خیر خواہ سمجھ لے تو اس کی کوئی بات قبول کرنے میں اسے تامّل نہیں ہوتا۔ وہ بے چوں وچرا اس کی ہر بات تسلیم کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اس لیے کہ اسے ایسے شخص سے کسی دھوکے کا اندیشہ نہیں رہتا، بلکہ وہ خیال کرتا ہے کہ یہ شخص مجھ سے یہ بات میرے اپنے فائدے کے لیے کہہ رہا ہے۔ انسان کی اس فطری کم زوری سے غلط کاروں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ خیر خواہ بن کر سامنے آتے ہیں، اپنی خیر خواہی کی قسمیں کھاتے ہیں، مخاطب کو اپنی ہم دردی اور وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ پھر اس کو اعتماد میں لے کر غلط راہ پر ڈال دیتے اور فریب میں مبتلا کردیتے ہیں۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں مذکور ہیں۔

ابلیس جب بارگاہِ الٰہی سے دھتکار دیا گیا تو اس نے عہد کیا کہ وہ آدم اور ذرّیت آدم کو ہر ممکن طریقے سے گم راہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ؑوا کو جنّت میں ٹھہرایا اور بہ طور آزمائش انھیں ایک مخصوص درخت کا پھل کھانے سے منع کردیا تو ابلیس نے انھیں حکم عدولی اور نافرمانی پر اکسانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے انھیں بہکایا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے تمھیں اس لیے روکا گیا ہے کہ اسے کھاتے ہی تم فرشتے بن جاؤ گے یا تمھیں ہیشگی کی زندگی مل جائے گی۔ یہ باتیں کہتے ہوئے اس نے خیر خواہی کی ہزارہا قسمیں کھائیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (الاعراف/۲۱)	اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حسد کے مارے ان کے خلاف ایک سازش رچی۔ انھوں نے باہم طے کیا کہ انھیں کہیں باہر لے جا کر قتل کردیں، یا بے یارومددگار چھوڑ دیں۔ چنانچہ انھوں نے جب اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام سے یوسفؑ کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت چاہی تو انھیں یوسفؑ سے اپنی محبت، خیر خواہی اور زور آوری کا یقین دلایا:

قَالُوْا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُوْنَ۔ (یوسف/۱۱)	انھوں نے (جا کر اپنے باپ سے) کہا "ابا جان، کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے، حالاں کہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں؟۔

یہ خیر خواہی سچی ہم دردی اور نیک مشورہ پر مبنی بھی ہوسکتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جب دو قبطیوں کے قتل کا راز فاش ہوگیا تو فرعون کے دربار میں انھیں سزا دیے جانے کا منصوبہ بنایا جانے لگا۔ اس کی بھنک ایک شخص کو لگ گئی تو اس نے بھاگ کر حضرت موسیٰ کو اس کی خبر کردی اور اپنی خیر خواہی کا واسطہ دے کر فوراً انھیں کہیں اور چلے جانے کا مشورہ دیا:

وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يَا مُوْسٰى إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ (القصص/۲۰)	اور ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا موسیٰ، سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، یہاں سے نکل جا، میں تیرا خیر خواہ ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انبیاء کرام کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ انھوں نے جب اپنی قوموں کے سامنے دعوتِ حق پیش کی تو انھیں اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا۔ ان سے بہ تاکید کہا کہ وہ جو تعلیمات لے کر آئے ہیں ان پر ایمان لانا ان کے اپنے مفاد میں ہے۔ اور وہ سچے ہم درد اور بہی خواہ کی حیثیت سے یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کے جواب میں ان کی قوم نے خود انہی کو گم راہ قرار دیا، مگر انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ رب العالمین کے فرستادہ ہیں اور جو کچھ پیش کر رہے ہیں اسی کے پاس سے لے کر آئے ہیں اور وہ ان کے سچے خیر خواہ ہیں:

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (الاعراف/۶۱-۶۲)

(نوحؑ نے) کہا "اے برادرانِ قوم، میں کسی گم راہی میں نہیں پڑا ہوں، بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمھارا خیر خواہ ہوں، اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔

پھر طویل دعوتی جدوجہد کے باوجود جب ان کی قوم ایمان نہ لائی اور کفر و شرک، سرکشی اور نافرمانی کی روش پر قائم رہی تو انھوں نے اپنی مایوسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ۔ (ھود/۳۴)

اب اگر میں تمھاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو میری خیر خواہی تمھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی، جب کہ اللہ ہی نے تمھیں بھٹکا دینے کا ارادہ کر لیا ہو۔

اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے جب انھیں جھٹلایا اور ان کی دعوت کو بے عقلی پر مبنی قرار دیا تو انھوں نے بہت دل سوزی کے ساتھ فرمایا کہ یہ بے عقلی کی باتیں نہیں، بلکہ رب العالمین کا پیغام ہے، جسے وہ خیر خواہی کے جذبے سے ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِىْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ۔ (الاعراف/۶۷-۶۸)

اس نے کہا ''اے برادرانِ قوم، میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمھارا ایسا خیر خواہ جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

جن قوموں نے پیغمبروں کی تعلیمات کو قبول نہیں کیا اور گم راہی میں پڑے رہے، تباہی و بربادی ان کا مقدّر بن گئی۔ قرآن نے ایسی متعدّد بستیوں کا تذکرہ کیا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ہلاک کر دیا۔ پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کی رہ نمائی میں وہاں سے محفوظ مقامات پر جاتے ہوئے بڑی حسرت اور افسوس کا اظہار کیا کہ ان لوگوں نے نصیحت قبول نہیں کی، جس کی بنا پر اپنے انجام سے دوچار ہوتے۔ قوم ثمود کی ہلاکت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّىْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ۔ (الاعراف/۷۸-۷۹)

آخر کار ایک دہلا دینے والی آفت نے انھیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ ''اے میری قوم، میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔

اسی طرح جب حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اپنے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دی گئی تو اس کے بارے میں انھوں نے ان الفاظ میں اپنے افسوس کا اظہار کیا:

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ آسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۔ (الاعراف/۹۳)

اے برادرانِ قوم، میں نے اپنے رب کے پیغامات تمھیں پہنچا دیے اور تمھاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبولِ حق سے انکار کرتی ہے۔

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی، اپنی امت کے لیے خیر خواہی، ان کی گم راہی پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکر مندی، ان کی ہدایت و کامرانی کی شدید خواہش اور راہ دعوت میں جاں فشانی کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی گواہی دے ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ۔ (التوبۃ/۱۲۸)

تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر، جب ایک لاکھ سے زائد افراد کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آپ کے ساتھ تھا، میدانِ عرفات میں آپؐ نے خطبہ دیا تو دورانِ خطبہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے سامعین سے دریافت کیا: ”تم لوگوں سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟“ تمام لوگ ایک آواز ہو کر پکار اٹھے:

نشهد انک قد بلغت و أديت ونصحت

ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا، اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔

یہ سن کر آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی، پھر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا:

اللّٰھم اشھد ؎ ”اے اللہ تو گواہ رہ“

۴- بے غرضی

دعوت کی تاثیر کے لیے ضروری ہے کہ داعی اپنے مخاطبین سے کسی قسم کے اجر کا طالب نہ ہو۔ وہ اپنے مدعوئین سے صاف الفاظ میں کہے کہ اس کی دعوت بے غرض ہے، وہ ان سے کسی مفاد کا امیدوار نہیں ہے، وہ ان سے مال چاہتا ہے نہ کوئی سہولت، بسا اوقات اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے کوئی بات کہتا ہے، اسے کوئی تدبیر سجھاتا ہے، کوئی حل بتاتا ہے، اس کا کوئی مسئلہ سلجھاتا ہے، ساتھ ہی اس سے اپنی کوئی منفعت بھی وابستہ کرتا ہے تو وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے اخلاص کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسے گمان ہونے لگتا ہے کہ اس کا اصل مقصود اپنی مطلب براری ہے، وعظ ونصیحت کا تو اس نے ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ اس صورت حال میں اس کی باتوں کا مخاطبین پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا اور اس کی نصیحت بے سود ہو جاتی ہے۔

انبیاء کرام نے جب بھی اپنی قوموں کے سامنے دعوتِ حق پیش کی، انھوں نے ساتھ ہی یہ بھی صراحت کی کہ وہ یہ بے لوث خدمت محض حکم الٰہی کی بنا پر انجام دے رہے ہیں، ان سے ان کی کوئی غرض یا منفعت وابستہ نہیں ہے۔ وہ ان سے کچھ مال چاہتے ہیں نہ کسی بدلہ کے خواہاں ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالاً إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ۔ (ھود/۲۹)

اور اے برادرانِ قوم، میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔

حضرت ھود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو صرف اللہ واحد کی عبادت کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (ھود/۵۱)

اے برادران قوم، اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اس کے ذمّے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟

سورۃ الشعراء میں حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے علاوہ حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کی دعوت بھی تفصیل سے مذکور ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سب نے اپنی بنیادی دعوت پیش کرنے کے ساتھ اپنے مخاطبین سے یہ بات بھی ضرور کہی کہ وہ جو خدمت انجام دے رہے ہیں اپنے رب کے حکم سے انجام دے رہے ہیں اور اسی سے اس پر اجر کے طالب ہیں، اس کے علاوہ وہ اور کسی سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ ہر ایک نے یہی کہا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۔ (الشعراء/۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰)

اور میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمے ہے۔

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے سامنے انبیاء سابقین کا اسوہ پیش کر کے اس کی اقتداء کرنے کا حکم دیا گیا اور کہا گیا کہ آپ بھی اپنی قوم پر واضح کر دیجیے کہ آپ ان سے کسی اجر کے خواہاں نہیں ہیں، بلکہ محض اللہ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ سورۂ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی مقام پر اٹھارہ پیغمبروں کے ناموں کی صراحت اور ان کا ذکر خیر کرنے کے بعد فرمایا:

أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ قُلْ لَّا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ۔ (الانعام/۹۰)

(اے نبی) وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، انھی کے راستہ پر تم چلو، اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لیے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے تعلق سے، دعوتِ دین کے بدلے طالبِ اجر نہ ہونے کا تذکرہ قرآن کریم میں متعدد پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔ کہیں بیانیہ انداز میں خبر دی گئی کہ آپؐ تو ان لوگوں سے کسی اجر کے طالب نہیں ہیں، کہیں ان لوگوں کی سرزنش کی گئی کہ جب آپ ان سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے پھر یہ کیوں ایمان نہیں لاتے اور آپؐ پر طرح طرح کے الزامات کیوں لگاتے ہیں؟ کہیں آپؐ سے ان لوگوں کے درمیان اعلان کر دینے کا حکم دیا گیا کہ آپ کسی اجر کے خواہاں نہیں ہیں۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ. وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ۔ (یوسف/۱۰۳-۱۰۴)

اور تم خواہ کتنا ہی چاہو، ان میں سے اکثر لوگ مان کر دینے والے نہیں، حالاں کہ تم اس خدمت پر ان سے کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے ہو۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْراً فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ۔ (الطور/۴۰)

یا کیا تم ان سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَن شَاءَ أَن يَتَّخِذَ إِلَى رَبِّهِ سَبِيلاً ۔ (الفرقان/۵۷)

(اے نبی) ان سے کہہ دو کہ ''میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔

انبیاء کے پیروکاروں اور ان کا اسوہ اختیار کرنے والوں کو بھی چاہیے کہ جب دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیں تو اپنے مدعوئین کے سامنے یہ نکتہ ابھار کر پیش کریں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا ہے، اس لیے وہ دوسرے انسانوں کو بھی سیدھی راہ پر لانا چاہتے ہیں۔ ورنہ ان کی کوئی دنیاوی غرض نہیں ہے اور وہ کسی اجر کے طالب نہیں ہیں۔ قرآن ایک بستی کا تذکرہ کرتا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے۔ بستی والوں نے ان رسولوں کو جھٹلایا، ان کا انکار کیا اور ان پر مختلف الزامات لگائے۔ اس موقع پر بستی ہی کے ایک شخص نے ان کی حمایت کی اور اپنے ہم وطنوں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا:

يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ. اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْراً وَهُم مُّهْتَدُونَ ۔ (یٰسٓ/۲۰-۲۱)

اے میری قوم کے لوگو، رسولوں کی پیروی اختیار کرلو، پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔

۵- نرمی

میدانِ دعوت میں کام کرنے والوں کا ایک مطلوب ترین وصف نرمی ہے۔ اہل ایمان کو اسے اپنا شعار بنانا چاہیے اور زندگی کے تمام معاملات میں اسے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مخاطبین کوئی بھی ہوں اور ان کا رویّہ کتنا ہی جارحانہ، ناگوار اور تکلیف دہ ہو، لیکن اشتعال انگیزی سے بچنا اور تحمّل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عہد نبوی میں منافقین اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ وہ اپنے ایمان کا دکھاوا کرتے، لیکن اصلاً دشمنانِ اسلام سے ساز باز رکھتے تھے۔ جب انھیں اللہ اور اس کے رسول کی سچی اطاعت کے لیے کہا جاتا تو اس سے منہ موڑتے اور اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تو دامنِ رسالت میں پناہ لیتے اور اپنے سابقہ رویّہ کی تاویلیں پیش کرنے لگتے تھے۔ اس صورت حال میں اگر ان کے خلاف کوئی سخت کارروائی کی جاتی تو غلط نہ ہوتا، لیکن اس کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ کو ان سے درگزر کرنے، وعظ و نصیحت سے کام لینے اور مؤثر انداز سے اپنی بات کہنے کی تلقین کی گئی:

أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا۔ (النساء/۶۳)

اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان سے اعراض کرو، انھیں سمجھاؤ اور ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔

یہود نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو منہ بگاڑ کر السام علیکم کہتے تھے۔ السام کے معنیٰ موت کے ہیں۔ گویا وہ ظاہر تو یہ کرتے تھے کہ سلام کر رہے ہیں، لیکن جو الفاظ ان کے منہ سے نکلتے تھے ان کا مطلب ہوتا تھا: تم پر موت آئے۔ ایک مرتبہ وہ آئے اور اسی انداز سے سلام کیا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے سن لیا تو انھیں طیش آ گیا۔ انھوں نے جواب دیا ''تمھارا یہی حال ہو، تم پر اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہو''۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے فرمایا:

''مَهْلًا يَا عَائِشَةَ، عَلَيْكِ بِالرِّفْقِ، وَإِيَّاكِ وَ الْعُنْفَ وَالْفُحْشَ''۔

ٹھہرو اے عائشہ، نرمی اختیار کرو، سختی اور بدزبانی سے بچو۔

ام المومنین نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول، آپ نے سنا نہیں، ان لوگوں نے کیا کہا ہے؟'' آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ''تم نے سنا نہیں، میں نے تم سے کیا کہا ہے''۔[۵]

دوسری روایت میں ہے کہ اس موقع پر آں حضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے یہ فرمایا تھا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"مَهْلاً یَا عَائِشَةَ، اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِی الْاَمْرِ کُلِّه ۔[۶]

ٹھہرو اے عائشہ، اللہ تمام معاملات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو نرمی اختیار کرنے کی نصیحت کی تو فرمایا:

اِنَّ الرِّفْقَ لَا یَکُوْنُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ، وَلَا یُنْزَعُ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ ۔[۷]

جس چیز میں نرمی ہوتی ہے وہ خوب صورت ہوتی ہے اور جس چیز میں نرمی نہیں ہوتی وہ بدصورت ہوتی ہے۔

انبیاء کرام کی سیرتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نرمی ان کی دعوت کا نمایاں وصف تھا۔ وہ جب لوگوں کو مخاطب کرتے تو ان کے لہجوں سے دل سوزی، خوش اسلوبی اور نرمی کا بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ وہ بہت ٹھنڈے اور دلوں کو چھو لینے والے انداز میں لوگوں کو مخاطب کرتے تھے اور ان کی اشتعال انگیزیوں کے جواب میں تحمل کا مظاہرہ کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ بت پرست، بت گر اور پروہت تھا۔ انھوں نے اس کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، انتہائی محبت اور دل سوزی کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اس کے سامنے توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد پیش کیے۔ اس پر وہ سخت برافروختہ ہوا۔ اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ "کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا" اتنی سخت کلامی کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب تھا: سَلٰمٌ عَلَیْکَ (سلام ہے آپ کو) (مریم/۴۱-۴۷)

فرعونِ مصر کا ظلم و جبر اور سرکشی مشہورِ عام ہے۔ اس نے پوری قوم بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا رسول بنا کر اس کی طرف بھیجا تو بہت نرمی کے ساتھ اس کے سامنے دعوتِ حق پیش کرنے کی تاکید کی:

اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی. فَقُلْ ھَلْ لَّکَ اِلٰٓی اَنْ تَزَکّٰی. وَاَھْدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰی ۔ (النّٰزعٰت/۱۷-۱۹)

فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ: کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہ نمائی کروں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سورۂ طٰہٰ میں یہ حکم الٰہی اور زیادہ صریح الفاظ میں ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ دونوں کو منصبِ نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد حکم دیا گیا:

اذْهَبَا إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى. فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى۔ (طٰہٰ/۴۳-۴۴)

جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔

سخت لب ولہجہ کسی کے لیے استعمال کیا جائے، اسے ناگوار ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی بات اپنوں سے کہی جائے یا پرایوں سے، اہل ایمان سے گفتگو کی جائے یا غیر مسلموں سے، ہر حال میں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ درشتی اور کرختگی سے دل پھٹتے اور دوریاں پیدا ہوتی ہیں، جب کہ نرمی سے دلوں میں محبت پیدا ہوتی اور قربتیں بڑھتی ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کی نرم مزاجی کو، اس پر اپنا احسان قرار دیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ۔ (آل عمران/۱۵۹)

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی، مطبعۃ حجازی، قاہرۃ، ۲/۳۴

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الانتہاء عن المعاصی، حدیث: ۶۴۸۳، مزید ملاحظہ کیجیے بخاری: ۳۴۲۶، مسلم: ۲۲۸۴

۳۔ ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، ۱۰/۳

۴۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب صفۃ حجۃ النبی ﷺ، حدیث: ۱۹۰۵

۵۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، ۶۰۳۰، صحیح مسلم، کتاب البر، ۷۹

۶۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، ۶۰۲۴

۷۔ صحیح مسلم، کتاب البر، باب فضل الرفق، ۲۵۹۴

☆☆☆

© rasailojaraid.com